"کلاسیکل" ڈسکورس کا، انقلابی ڈسکورس سے فرق

حامد کمال الدین

سماج، سیاست، جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اصلاح اور احیائے دین وغیرہ ایسے معاملات اور مسائل کو دیکھنے کے لیے یہاں دو اپروچ پائے جاتے ہیں؛ اور دونوں اپنی نہاد میں بے حد مختلف:

ایک: کلاسیکل[1]۔

دوسرا: انقلابی۔

بے شک ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس کے ہاں یہ دونوں اپروچ خلط ملتے ہیں۔ پھر اِس 'خلط' کا نسبت تناسب مختلف حلقوں میں مختلف ملے گا۔[2] (یعنی کسی کے ہاں انقلابی منہج

---

[1] "کلاسیکل" کے لیے عرب کے بعض علمی حلقوں میں ایک خاصا جچا تلا لفظ "سَلَفی" مستعمل ہے۔ یعنی وہ ایک منہج جو امت کے دورِ اول سے ماخوذ چلا آتا ہے۔ عین اس معنیٰ میں ہم بھی ضرور یہ لفظ استعمال کرتے اگر ہمارے برصغیر میں یہ بدقسمتی سے "ردِّ حنفیت" کے لیے مخصوص نہ ہوتا۔ حالانکہ سوچا جائے تو "حَنَفی" دراصل "سَلَفی" مذاہب میں سے ہی ایک مذہب ہے (اہل کوفہ کے تابعین وتبع تابعین سے چلا آتا ایک مذہب)۔ لہٰذا ایک الجھن سے دور رہنے کے لیے ہم "کلاسیکل" کے لفظ پر ہی اکتفاء کریں گے۔ ورنہ وہ دوسرا لفظ کہیں مناسب تر تھا۔

[2] اس لحاظ سے، ان دو اپروچوں کو تو ہم "دو الگ الگ اپروچ" ہی کہیں گے۔ البتہ جہاں تک کسی ایک شخصیت یا جماعت کا تعلق ہے تو اس میں یہ دونوں اپروچ مختلف نسبت تناسب سے خلط بھی ملیں گے، الا ماشاء اللہ۔ خاص طور پر "انقلابی" سائڈ پر یہ کہنا مشکل ہو گا کہ یہاں کلاسیکل

نمایاں تر تو کسی کے ہاں کلاسیکل منہج غالب تر) تاہم "اجتماعی فرائض" کو سمجھنے کے حوالے سے، ہیں یہ دو الگ الگ دھارے۔ اگر آپ مجھ سے کہیں، میں ان دونوں کے مابین ایک موٹی لکیر کھینچ کر واضح کروں کہ اصل فرق ہے کیا... تو یہاں میں اس کی علمی بنیادوں اور دلیلوں میں جائے بغیر چند عملی کسوٹیاں touchstones آپ کے گوش گزار کر سکتا ہوں:

1. انقلابی منہج میں ایک قیادت، اور اس کے پیچھے کھڑا ایک گروہ، باقاعدہ اقتدار کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے لیے ایک کیمپین campaign کرتا ہے۔ (اقتدار کا یہ مطالبہ بے شک وہ اپنی ذات کے لیے نہیں کرتا بلکہ دین کے نفاذ کی خاطر ہی کرتا ہے، البتہ ہوتا وہ ایک اقتدار کا مطالبہ ہے)۔ جس کا سادہ مطلب، کسی لگی لپٹی کے بغیر، یہ ہوتا ہے کہ اِس کشمکش کے نتیجے میں برسر اقتدار طبقوں کو اس کرسی سے بے دخل ہونا ہے اور اقتدار کے کچھ نئے دعویداروں کو اس پر متمکن ہونا ہے؛ جس کے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ انجامِ کار؛ دونوں فریقوں کی ایک بڑی سرگرمی ایک دوسرے کے مقابلے پر 'اقتدار نہ چھوڑنے' اور 'اقتدار چھڑوا کر رہنے' کے گرد گھومتی ہے اور یہی؛ فریقین کے مابین ایک بڑا (یا شاید مرکزی) باعثِ نزاع۔ جبکہ کلاسیکل منہج میں اقتدار کے مطالبے کے ساتھ میدان میں اتری ہوئی کوئی قیادت یا جماعت سرے سے نہیں ہوتی۔[3] [4] "سٹیٹس کو" پر کڑی سے کڑی تنقید کلاسیکل منہج میں بھی ہو سکتی ہے اگر

اپروچ سو فیصد مفقود ہے۔ عموماً یہی کہا جا سکے گا کہ ایک شخص یا جماعت کے ہاں "انقلابی" اپروچ "کلاسیکل" اپروچ پر غالب ہے۔ ظاہر ہے، کسی کے ہاں زیادہ غالب ہو گی تو کسی کے ہاں کم۔

[3] ہاں معاملہ اس سے الٹ ضرور ہوتا ہے۔ یعنی برسر اقتدار طبقے ان مصلحین کا کیس case کمزور کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ان کی یہ بھاگ دوڑ اصل میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہے۔ جبکہ وہ مصلحین اسے برسر اقتدار طبقوں کی جانب سے لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانے کی

معاملہ اس کا متقاضی ہو (حدیث کے الفاظ میں: **أفضل الجهاد كلمةُ حقٍ عند سلطانٍ جائر**) تاہم اقتدار کی منتقلی کا کوئی مطالبہ اِس منہج کا بنیادی حصہ نہیں۔ اس معاملے کو کلاسیکل منہج بالکل ایک اور طریقے سے لیتا ہے۔

2. انقلابی منہج کا ایک بہت بڑا اور مرکزی موضوع 'نظام' ہوتا ہے۔ نظام نہیں بدلا تو گویا کچھ نہیں بدلا! کوئی بھی بڑی سے بڑی پیش رفت تقریباً بے معنیٰ ہے جب تک سیاست کا

ایک کوشش پر محمول کرواتے ہیں۔ اور کسی وقت ان کے اس الزام کو ایک خندۂ استہزاء کے ساتھ لیتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہے کہ ایک فکری یا سماجی نزاع میں، جو کہ مصلحین کی قوت strength کا اصل میدان ہوتا ہی ہے، "اقتدار کے طلبگار" کے طور پر سامنے نہ آنا ان کی اپنی قوت strength کا ہی ایک اور بڑا راز ہوتا ہے۔ جبکہ اقتدار کے مطالبہ کے ساتھ میدان میں آنا ان کے کیس کو کمزور کر دینے والا ایک پوائنٹ؛ تبھی مستکبرین لوگوں کی توجہ بار بار 'اس' طرف دلاتے ہیں؛ بصورتِ دیگر مستکبرین اس پوائنٹ کو اپنے حق میں نہ لاتے۔ فتدبّر

[4] یہ سمجھنا غلط ہے کہ "اقتدار" کے مطالبے کے ساتھ میدان میں اترنے کا تعلق اِس مسئلہ سے ہے کہ آیا مقابلے پر کفر ہے یا محض فسق و فجور۔ جہاں تک انقلابی جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ لازماً "اقتدار کی منتقلی" کا ایجنڈا لے کر میدان میں اترتی ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ نظامِ رائج کو کفر سمجھتی ہیں یا فسق۔ اور جہاں تک کلاسیکل ذہن کا تعلق ہے تو وہ کسی بھی قسم کی صورتحال situation میں "اقتدار" کے دعویدار کے طور پر سامنے آنے کا منہج نہیں رکھتا چاہے سامنے کفر ہو یا فسق۔ حتیٰ کہ اِس (کلاسیکل) ڈسکورس میں صحابہؓ کو بھی ایک ایسی جماعت کے طور پر نہیں دیکھا جاتا جو مکہ کے مقتدر طبقوں سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ "اقتدار" اس کے سپرد کیا جائے، باوجود اس کے کہ صحابہؓ کے مقابلے پر کفر ہی تھا۔ یہ (کلاسیکل) ڈسکورس دراصل معاملے کو "مطالبۂ اقتدار" کی نظر سے دیکھتا ہی نہیں ہے اور اِس کی سعی کی جہتیں اور اپنے کیس case کے حق میں قوت strength پانے کے اعتبارات بالکل اور ہیں۔

معاملہ ہاتھ میں نہیں لیا جاتا اور 'سٹیئرنگ' قابو نہیں آ جاتا۔ جبکہ کلاسیکل منہج کے مرکزی موضوعات "عقیدہ"، "ملتوں کا اختلاف" اور "استطاعت" کے محور سے جڑی ہوئی "اقامتِ شریعت کروانا" ہوتی ہے۔ "امت" کی تعلیم یا توسیع یا بہبود یا دفاع یا فتوحات کسی وقت 'سیاسی معاملات' سے بڑھ کر ایک ترجیح ہوتی ہے۔

3. کلاسیکل ڈسکورس میں أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ کا جلی تر مطلب: دین کو مستقیم رکھنا، دین کو اس کی صحیح کھری ٹھیٹ بنیادوں پر قائم رکھنا اور اس میں کوئی فرق اور تفرقہ نہ آنے دینا ہے۔ جبکہ "دین" بھی اصل میں توحید اور رسالت کے معنیٰ میں ہے۔ جس کے اندر عین اُسی آسمانی حقیقت پر رہنا جو "عبادت" کے باب میں بذریعہ "رسالت" دیا گیا۔ یہ امتوں اور ملتوں کے حق میں دراصل ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ کیونکہ نئے نئے فرقے آ کر اُس آسمانی حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور تھوڑے عرصے میں عقیدہ اور شریعت کے معاملہ میں امت کی پٹڑی سرک کر کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ صحیح آسمانی دین اس قدر متنازعہ، نادستیاب اور تحریف زدہ ہو جاتا ہے کہ (پچھلے ادوار میں) کچھ ہی دیر بعد ایک نئی رسالت کی ضرورت آ پڑتی رہی ہے۔ اس لحاظ سے "اقامتِ دین" کا قوی تر حوالہ: دین کو اُس کی حقیقت پر رکھنا اور اس میں سرِ مو فرق نہ آنے دینا ہے۔ جس میں دین سے **تحریف الغالین**[5] اور **انتحال المبطلین** اور **تأویل الجاهلین** کو دفع کرنا آتا

---

[5] **تحریف الغالین** یعنی غالی طبقوں کا دین میں تحریف کرنے لگنا (لفظی یا معنوی)
انتحال المبطلین یعنی باطل پرستوں کی بناوٹ۔ (خانہ سازیاں، فکری وارداتیں)
تأویل الجاهلین یعنی جاہلوں کا دین کو نرالے معانی پہنانا۔
یہ تینوں کلمات حدیث میں آئے ہیں:
وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

ہے۔ دین کو زمانے کی دھول اور ناپاکیوں سے صاف کرنا۔ روزِ اِس کے صحن میں جھاڑو دینا۔ غرض دین کو عین اُسی حقیقت پر رکھنا جس پر زمین میں ملتِ آسمانی ایک بار کھڑی کروائی گئی تھی اور جس ڈھب پر انسانوں کو خدا کے آگے جھکایا گیا تھا: [6] شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ۖ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّـهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ. وَمَا تَفَرَّقُوا

عَلَيْهِ وَسلم: «يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِين» . رَوَاهُ الْبَيْهَقِيّ ، وصححه الألباني في تخريجه على مشكاة المصابيح كتاب العلم ، الفصل الأول ، رقم الحديث 248)

روایت ابراہیم بن عبد الرحمن عذری سے، کہا: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

اِس علم کے حامل ہوتے رہیں گے ہر نئی نسل میں سے اُس کے معتبر ترین لوگ: کہ جو اس (علمِ دین) سے دفع کریں گے:

- **غلو پسندوں کی تحریف کو،**
- **باطل پرستوں کی گھڑت کو، اور**
- **جاہلوں کے (اسے) نرالے معانی پہنانے کو۔**

[6] یہ وجہ ہے کہ "اقامتِ دین" سے متصل قرآنی مقامات "اختلاف" اور "تفرقہ" کا مضمون لے کر آتے ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ خود "اختلاف" اور "تفرقہ" ایسی اصطلاحات ائمۂ سنت کے کلاسیکل ڈسکورس میں ایک اور معنیٰ رکھتی ہیں جو سب سے بڑھ کر دینِ حق سے انحراف اور اس میں اختلاف کرنے پر لاگو ہوتا ہے۔ اس کے ازالہ میں خود بخود باطل فرقوں کا ایک قوی ابطال آتا ہے۔ جبکہ انقلابی منہج میں "اختلاف" اور "تفرقہ" کسی حد تک آج کے میڈیائی مفہومات کے قریب ہے، یعنی رہو اپنے اپنے انحراف پر بس ایک دوسرے کو چھیڑو مت؛ 'عقیدے' میں کیا جھگڑا! جھگڑا ہو تو 'سیاست' میں اور 'کرپشن' وغیرہ ایسے مسئلوں پر! عقیدہ تو لوگوں کا ایک 'ذاتی' معاملہ ہے!

إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ.[7] پس

- بیرون میں باطل ادیان اور اندرون میں گمراہ فرقوں کے ساتھ نظریاتی محاذ پر ایک دُوبدُو جنگ
- اور دینِ حق کا زیادہ سے زیادہ احقاق کرنا، نفوس پر اس کی دھاک بٹھانا اور معاشرے کو اس پر زیادہ سے زیادہ پختہ اور یکسو کرانا اور اس سے ہر گز نہ ہٹنے دینا

اِسی مطلب کے تحت آئے گا۔ یہاں؛ مشرکین و اہل کتاب سے اپنے ملّی فرق کو نمایاں اور غالب کر کے رکھنا دین کی اقامت و اِظہار میں آتا ہے۔ جہان سے شرک کو مٹانا، الحاد کی سرکوبی، بُتوں کے ساتھ دشمنی، کفر کو زک پہنچانا، بے دینی کو شنیع بنا کر رکھنا، اسلام کے واحد حق ہونے کی ہیبت نفوس میں قائم کروانا اور اس کے ماسوا کو اذہان میں متروک، معیوب، مردود اور اچھوت بنا کر رکھنا، غیر اسلام کو ناآئین outlaw کر کے رکھنا یہ سب "دین کو قائم رکھنے" میں آئے گا۔ 'حکومت' وغیرہ پر اثر انداز ہونا اس کے یہاں اگر "اِقامتِ دین" میں آئے گا تو اِس اصل مطلب کی ذیل ہی میں لا کر، اور بشرطِ دستیابی ایک ذریعہ جانتے ہوئے؛ جبکہ اصل زور "اقامتِ دین" کے باب میں پھر بھی وہیں پر رہے گا۔ یہ ہے کلاسیکل ڈسکورس، جو کتبِ عقیدہ[8] سے پھوٹ پھوٹ کر آتا ہے۔ ادھر انقلابی ڈسکورس میں: أَنْ أَقِيمُوا

---

[7] (الشوریٰ:13،14) "راہ ڈال دی تم کو دین میں، وہی جو کہہ دیا تھا نوح کو، اور حکم (وحی) بھیجا (ہے اے محمدؐ) ہم نے تیری طرف، اور وہ جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو، اور موسیٰ کو، عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔ بھاری پڑتا ہے شریک والوں کو، جس طرف تو بلاتا ہے ان کو۔ اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہے۔ اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع لائے۔ اور پھوٹ جو ڈالی (فرقوں میں بٹے)، سو سمجھ آچکے، پیچھے آپس کی ضد سے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

[8] اسلامی کتبِ مصادر source books میں پورا ایک شیلف پایا جاتا ہے، جس میں اسلام کے

سٹینڈرڈ عقیدہ کا بیان ملتا ہے۔ اس پورے شیلف کی تالیف زیادہ تر "كتاب السنة" کے زیر عنوان ہوئی ہے (کتبِ حدیث اور چیز ہے، یہ کتاب السنۃ ایک اور چیز ہے)۔ شیخ عثمان جمعہ الضمیریہ اپنی کتاب مدخل لدراسة العقيدة الاسلامية میں "كتاب السنة" کے عنوان سے متقدمین کی 19 کتابوں کی فہرست دیتے ہیں:

1. "السنة" لابن أبي شيبة المتوفى 235هـ.
2. "السنة" لأحمد بن حنبل المتوفى 241 هـ
3. "السنة" للأثرم المتوفى 273هـ.
4. "السنة" لأبي علي المتوفى 273هـ.
5. "السنة" لأبي داود السجستاني المتوفى 275هـ.
6. "السنة" لابن أبي عاصم المتوفى 287هـ.
7. "السنة" لعبد الله بن الإمام أحمد المتوفى 290هـ.
8. "السنة" لأبي بكر المروزي المتوفى 292هـ.
9. "السنة" لمحمد بن نصر المروزي المتوفى 294هـ.
10. "السنة" لأبي بكر الخلّال المتوفى 311هـ.
11. "السنة والجماعة" للطحاوي المتوفى 321هـ.
12. "السنة" للعسال الأصفهاني المتوفى 349هـ.
13. "السنة" لأبي القاسم الطبراني المتوفى 360هـ.
14. "السنة" لأبي الشيخ الأصبهاني المتوفى 369هـ.
15. "السنة" لأبي جعفر البغدادي المعروف بابن شاهين المتوفى 385هـ.
16. "السنة" لابن مندة الأصبهاني المتوفى 395هـ.
17. "السنن" أو "شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة" للالكائي المتوفى 418هـ.
18. "السنة" لأبي ذر الهروي المتوفى 434هـ.
19. "الرسالة في السنة" لأبي عثمان الصابوني المتوفى 449هـ۔

شیخ عثمان جمعہ کی ذکر کردہ کتب کے علاوہ بھی کچھ امہات الکتب جو ''السنۃ" کے عنوان سے اکابر ائمہ کے ہاتھوں تالیف ہوئیں:

20. "صريح السنة" لأبي جعفر مُحَمَّد بن جرير الطبري المتوفى 310 ھ۔
21. "شرح السنة" لأبي مُحَمَّد الحسن بن علي البربهاري المتوفى 329ھ۔
22. "أصول السنة" لابن أبي زمنين المتوفى 399 ھ۔
23. "التمسك بالسنن والتحذير من البدع" للإمام الذهبي المتوفى 748 ھ۔

''کتاب السنۃ" کے علاوہ بھی کچھ عنوانات کے تحت اِس شیلف میں کتبِ مصادر ہیں:

24. "الفقه الأكبر" جو کہ امام ابو حنیفہؒ (متوفی 150ھ) سے منسوب ہے۔ گو صحیح تر یہ کہ ان کے اصحاب میں سے کسی نے تالیف کی اور اس میں امام ابو حنیفہ سے ماثور عقیدہ ہی بیان کیا۔
25. أصول السنة للحميدي المتوفى 219 ھ۔
26. "الإيمان" للقاسم بن سلّام المتوفى 224 ھ۔
27. ''شرح السنۃ" مؤلفہ امام مزنیؒ (م264ھ)،
28. "التوحيد" لابن خزيمة المتوفى 311 ھ۔
29. الإبانة عن أصول الديانة مؤلفہ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ متوفی 324 ھ۔
30. "الشريعة" لأبي بكر مُحَمَّد بن الحسين الآجري المتوفى 360 ھ۔
31. "الإبانة الكبرى" لأبي عبد الله عبيد الله بن مُحَمَّد المعروف بابن بطة العكبري المتوفى 387 ھ۔
32. "لمعة الاعتقاد" موفق الدين ابن قدامة المتوفى 620 ھ۔

''دین" کی حقیقت پر قائم رہنے (السنۃ والجماعۃ)، اور انحرافات (فرقوں، اھواء) کو پاس نہ

الدِّینَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِیهِ کا مرکزی ترین حوالہ ایک عدد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ دین کو قَیِّم (ٹھیٹ، ٹکسالی) رکھنے (شرک و بے دینی کا ابطال اور بدعات و نافرمانی کی گوشمالی وغیرہ) ایسے مفہومات ان حضرات کے ہاں اگر ''اِقامتِ دین'' میں آئیں گے تو ایک ذیلی اور ثانوی حیثیت میں ہی۔ [مثال کے طور پر: جہمیہ یا باطنیہ ورافضہ ایسی گھٹاٹوپ ضلالتوں کے ردّ کو اِس طبقے کے سامنے اگر آپ ''اقامتِ دین'' میں شمار کریں تو یہ اس پر متعجب ہو گا۔ اس لیے کہ 'حکومتِ الٰہیہ' کے قیام سے بھلا اِس مسئلہ کو کیا تعلق! (بلکہ بدعتی ٹولوں کا رد کرنا تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں الٹا ایک رکاوٹ اور 'تفرقہ' باور ہو گا!) یہاں ایک محدِّث امت کے روزمرہ و محاورہ سے زنادقہ کی ڈالی ہوئی موضوعات کو نکال باہر کرنے کی اَن تھک سعی کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا دین اُجلا اور نکھرا ہو جاتا ہے۔ باطل کے اندھیرے قلوب سے چھٹتے اور حق کا نور یہاں چھا جاتا ہے... اور آپ اُس محدث کی اِس سعیِ مشکور کو دین کی اقامت میں گنتے ہیں تو یہ طبقہ اس پر حیرت زدہ ہو گا۔ امت کا کوئی طبقہ قادیانیت یا سیکولرزم کے بخیے ادھیڑتا ہے اور مسلم اذہان کو لبرلزم کے اثرات سے پاک کر کے خالص دین پر یکسو کرواتا ہے تو اسے بھی شاید یہ ''اقامتِ دین'' شمار کرنے پر آمادہ نہ ہو، سوائے اس باب سے کہ اس کا یہ فعل 'اسلامی حکومت' قائم کرنے میں ممدّ ہو سکتا ہے یا اسلامی حکومت کے راستے کی کچھ رکاوٹیں دور کرنے میں موثر ہو سکتا ہے؛ نہ کہ فی نفسہٖ اس عمل کو اقامتِ دین گنے گا۔ وغیرہ]۔

4. انقلابی ڈسکورس میں 'مراحل' کا ایک فلسفہ بھی کسی نہ کسی طور شامل ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کسی کے ہاں کتنے 'مرحلے' ہوں اور کسی کے ہاں کتنے۔ اور اِس تقسیم کے

پھٹکنے دینے ایسے معانی سب سے زیادہ ان کتب میں بیان ہوتے ہیں۔

بموجب؛ کوئی خود کو کسی مرحلے میں جانتا ہو گا اور کوئی کسی مرحلے میں۔ 'مکی مرحلہ' اور 'مدنی مرحلہ' تو بالعموم ہوتا ہی ہے۔ یہاں؛ دین کے بہت سے اعمال 'ابھی' انجام دیے جانے پر باقاعدہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس چیز کا تو 'مرحلہ' آیا ہی نہیں، ابھی یہ کام دین میں کیونکر جائز ہو گا! دوسری جانب، کلاسیکل ڈسکورس 'مراحل' ایسے فلسفے کو ہکا بکا ہو کر سنتا ہے۔ نبی ﷺ پر دین پورا اتر آنے کے بعد اب قیامت تک پورے کا پورا واجب العمل ہے۔ اس میں کوئی تقدیم اور تاخیر دین کا مسئلہ نہیں۔ 'مرحلہ' ایسی کسی دلیل سے دین کی کسی ایک بھی بات پر عمل موقوف نہ ہو گا۔ ہاں دین پر عمل کسی چیز سے مشروط ہے تو وہ ہے آپ کا ایک بات کی قدرت و استطاعت رکھنا؛ خواہ بطورِ فرد اور خواہ بطورِ جماعت۔ یہ "قدرت و عدم قدرت" البتہ ایک صالح اعتبار ہے اور نصوصِ شریعت میں جابجا بیان ہوا ہے۔

5. انقلابی ڈسکورس میں "عبادات" کو حکومتِ الٰہیہ کے لیے درکار افراد کے اندر مطلوبہ 'مواصفات' یا 'تقاضوں' کے طور پر دیکھنے تک کی نوبت آتی ہے۔[9] جبکہ کلاسیکل ڈسکورس "عبادات" اور "پابندیِ حلال و حرام" کو آپ اپنی ذات میں مقصود جانتا ہے۔ خدا کو سجدہ کرنا، خدا کی تسبیح اور پاکی بیان کرنا اور اُس کی عبادت کے جملہ افعال بجالانا آپ اپنی ذات میں مطلوب ہے اور بجائے خود تخلیقِ جن و اِنس کی غایت۔ یہاں سے؛ شرک اور توحید کے پیراڈائم میں بھی فریقین کے ہاں ایک واضح فرق آجاتا ہے۔ اور وہ جابجا نظر آتا ہے۔ غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا خالق کی صفات میں تشبیہ یا تعطیل لانا آپ اپنی ذات میں فساد، اشتعال انگیز اور دین کو مسمار کر دینے والا ایک

[9] اور بعض کے ہاں 'مواصفات' اور 'تقاضوں' کے طور پر بھی نہیں! "حزب التحریر" کی مثال ذرا ایک اور پہلو سے آگے چل کر آرہی ہے۔

فعل ہو گا اور اس کا اِبطال بجائے خود "دین کو قائم رکھنا"۔ (کلاسیکل ڈسکورس)۔ جبکہ انقلابی ڈسکورس میں یہ نرا 'علم الکلام' کا مسئلہ! 'نظامِ حکومت' سے جب اس کا کوئی خاص تعلق نہیں تو اس (مسئلۂ صفاتِ خداوندی) کو مسلم ذہن کی تشکیل کے کسی مرکزی ترین مضمون کے طور پر لانا بے جا ہو گا۔ یا شاید ناروا! 'خدا کا بیٹا' ایسا لفظ سن کر آدمی کو ایک جھرجھری آئے اور وہ بے ساختہ اُس ذہنی کیفیت سے گزرے جو 'مکی مرحلے' کی ایک سورت میں باقاعدہ نفوس کے اندر اتاری جاتی[10] ہے: تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَن دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾

---

10 اس سلسلہ میں نمایاں ترین انتہاء extreme ہمارے اِس ماحول کے اندر پائی جانے والی تعبیراتِ دین میں "حزب التحریر" کا ڈسکورس ہے۔ مکی قرآن میں بتوں کی پوجا، دیویوں کی رضاجوئی، نجوم اور ارواح کے آگے اظہارِ ذلت وغیرہ ایسے شرکیہ اعمال کی جو پورے ایک تسلسل کے ساتھ مذمت اور ابطال ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کا خود اس 'مکی مرحلہ' میں ہی ان شرکیہ افعال کی ایک مسلسل نفی کرنے کو خدا کی تعظیم کا باقاعدہ عنوان بنانا... اِس سارے عمل کو ہمارے یہ بھائی اس مہارت کے ساتھ گول کرتے اور 'طلبِ اقتدار' کا عنوان بناتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ وہ سارا شرک جو تنزیلِ آسمانی اور سیرتِ نبوی کے مکی بیان میں لوٹ لوٹ کر ذکر ہوتا ہے، اس کی بابت ان بھائیوں کے یہاں کچھ ایسی سوچ دیکھنے میں آتی ہے کہ: ایسی باتوں کے ابطال پر وقت لگانے اور نفوس میں اس کو گہرا اتارنے کی محنت نری غیر ضروری ہے؛ ان تمام شرکیات کو ختم کرنا تو 'خلافت' لے آنے کے بعد محض ایک آرڈیننس کی مار ہے! لہٰذا ستّر (70) اَسی (80) سال تک یا پھر اس سے بھی زیادہ (غیر معینہ) عرصہ تک (یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) افعالِ شرک کا اِبطال نام لے لے کر کرنا یکسر موقوف؛ اِس سارے عمل کی جگہ صرف خلافت خلافت پکارنا ہی سنت اور سیرت کی صحیح رِیڈنگ reading ہے!

وَمَا يَنبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَن يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿92 مریم﴾[11] پروردگارِ عالم کی بابت ایسی شرکیہ بات منہ سے نکالنے والے کو آدمی 'حکمران کے ظلم' سے بھی سنگین تر دیکھے اور ایسی بات کو جہان سے مٹانے کے لیے 'حکمران کے خلاف سرگرم ہونے' سے بھی بڑھ کر بے چین ہو جائے... خدا کے وصف پر باطل اقوال کی غلاظتیں پڑتی دیکھے تو آدمی کے بحر کی موجوں میں ایک غیر معمولی ہیجان اور اضطراب آئے اور وہ خدا کے وصف کو اس سے دھونے اور اُجلا کرنے کے لیے ماہیِ بے آب ہو ("تسبیح" کا ایک باقاعدہ معنیٰ)... ایسی طبیعتیں اور مزاج آپ کے اندر کلاسیکل منہج ہی پیدا کرتا ہے۔ انقلابی منہج تو اِس کو 'کی مرحلے' کا جزوِلاینفک بھی شاید نہ گنے!

6. کلاسیکل ڈسکورس میں آپ کا مرکزی ترین فوکس: "معاشرہ" ہو گا۔ جبکہ انقلابی ڈسکورس میں: "حکومت"۔ اول الذکر کا بنیادی ترین میدان "عقول" اور "نفوس"، جبکہ ثانی الذکر کا "اختیارات"۔

7. اسلامی تاریخ پڑھنے میں بھی یہاں ایک اپروچ کا فرق آجاتا ہے۔ کلاسیکل ڈسکورس خلافتِ راشدہ کو اسلام کے ایک مثالی دور کے طور پر لیتا ہے۔ البتہ "مثالی" سے نیچے صرف صفر ہی نہیں ہوتا! تاہم انقلابی ڈسکورس اسلامی تاریخ پڑھنے کے دوران معاملے کو تقریباً یوں دیکھتا ہے گویا ایک چیز یا تو پورا سو ہوتی ہے یا صفر؛ بیچ میں کچھ نہیں! چنانچہ اس ذہن سے تاریخ پڑھتے ہوئے؛ اسلامی تاریخ تیس سال کے بعد قریباً سائیں سائیں کرنے لگتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ: کسی دَور یا کسی اجتماعی واقع کو جانچنے میں وہاں کی 'سیاسی صورتحال' کو کچھ زیادہ ہی یا شاید کُلی وزن دے ڈالنا۔ جبکہ تاریخ کو 'معاشروں'

---

[11] "قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ جاویں۔ زمین شق ہو جاوے۔ اور پہاڑ زمین پر دھڑام ہو جاویں۔ کہ انہوں نے رحمٰن کا بیٹا پکار ڈالا! حالانکہ نہیں یہ شان رحمٰن کی کہ وہ بیٹا جنے"۔

یا 'تہذیبوں' کی نظر سے پڑھنا، ادیان کی کشمکش اور ملتوں کی آویزش کی نظر سے پڑھنا تقریباً یہاں اوجھل ہے۔ حالانکہ تاریخ پڑھنے یا ایک اجتماعی واقع کو جانچنے کی یہ کوئی چھوٹی جہت نہیں۔ پھر یہ معاملہ 'تاریخ' پڑھنے پر موقوف نہیں؛ خود "نظر" ہی سے متعلق ہے۔ اصل میں اس کے اندر وہ تمام ترجیحات پوشیدہ ہیں جو ہمارے ائمہ متقدمین کے یہاں معاملات کو دیکھنے میں پیش نظر رہی تھیں، اور جن کے تحت افریقہ، اندلس، ایشیا (خود ہمارا برعظیم پاک وہند) اور مشرقی یورپ کا ایک بڑا حصہ خلافتِ راشدہ کے بعد ہی کامیابی کے ساتھ اسلام کے زیر نگیں لے آیا گیا اور یہاں شرک کے اندھیرے ختم کر ڈالے گئے تھے۔ پس اصل مسئلہ ایک "ملی جلی ہوئی صورتحال" کو دیکھنے اور سلجھانے میں ہے جو خلافتِ راشدہ کے ختم ہونے کے بعد سے لے کر آج تک چلی آتی ہے اور خدا ہی جانے کب تک جاری رہتی ہے۔ (اغلباً قربِ قیامت تک جاری رہے گی)۔ ایسی "ملی جلی ہوئی صورتحال" کو پچھلے چودہ سو سال سے یہ کلاسیکل ڈسکورس ہی سنبھالتا آیا ہے اور یہ صرف اسی کے سنبھالنے کی ہے۔

8. "کام" کا فارمیٹ کلاسیکل منہج کے اندر خالصتاً 'دعوتی' ہوتا ہے۔ یعنی ایک سلسلۂ رشد و ہدایت اور بس۔ (باقی بہت کچھ ہوتا ہے؛ مگر اپنے اپنے سیاق میں لا کر، اور اپنے اپنے خانوں میں رکھ کر، اور خاص احوال وظروف کی رعایت سے۔ البتہ عمل کا ایک عمومی دھارا اِس کلاسیکل فارمیٹ میں ان تین چیزوں پر ہی مبنی ہوتا ہے: علماء و طلبۂ علم کی کھیپ برآمد کرنا، عوام کو رشد و تلقین، اور حکام کو پند و نصیحت اور ان کے معاملات پر گہری نظر اور وہاں دستیاب عوامل کو ہلانا جلانا maneuvering)۔ ادھر انقلابی منہج کے اندر "کام" کے فارمیٹ کو لازماً 'تنظیمی' ہونا ہوتا ہے۔

[کام کے 'دعوتی' و 'تنظیمی' فارمیٹ کے فرق کی کچھ وضاحت: 'دعوتی' سے ہماری مراد: کسی خاص عقیدہ یا نظریہ یا عمل یا رویّے کو لوگوں سے منوانے اور ان سے اس پر عمل

کروانے پر ہی داعیوں کا کل زور ہوتا ہے اور اس سے متصادم کسی عقیدے یا نظریے یا عمل یا رویّے کو نفوس کے اندر شکست دینے پر ہی کل توجہ رکھی جاتی ہے۔ سب شور، سب اختلاف، سب تزکیز اسی پر ہوتی ہے۔ یعنی عقائد، نظریات، اعمال، اخلاق اور رویّے ہی دعوت کا کل مضمون ہوتے ہیں؛ سلباً یا ایجاباً۔ اور اس کے نتیجے میں آگے آنے والوں میں سے (1) خواص کو طلبہ و علماء میں ڈھال دینا اور ایسے نور کے مناروں کی ایک سے بڑھ کر ایک کھیپ نکال دینا۔ (2) اور اس کے ذریعے عامۃ الناس کو تلقین و ارشاد۔ (3) جبکہ بااثر طبقوں میں اثر و رسوخ (اور اِرادتمند) رکھنے کو دین کی تمکین کا ذریعہ بنا کر رکھنا؛ اور یہاں جتنے مہرے خالص اسلامی ایجنڈا کے لیے ذہانت اور ہوشمندی سے ہلائے جاسکتے ہوں، ہلانا اور کسی کسی وقت تو بااثر طبقوں میں اپنے ارادتمندوں کی پشت پر کھل کر آجانا (کسی جہادی یا اصلاحی مہم میں اپنے پیروکاروں کو لے کر باقاعدہ ان کے ہم رکاب چلنا) البتہ یہاں بھی 'مثالی' ہونے کی بجائے اندریں صورت 'جو مل سکتا ہو' اسے ہی لینے پر اکتفاء کرنا (اِس آخری بات کو تو کلاسیکل منہج کا مرکزی ترین نقطہ جانیے)۔ جبکہ اس کے مقابلے پر 'تنظیمی' فارمیٹ سے ہماری مراد: جس میں کسی کو 'جوائن' join کرنے یا نہ کرنے کا معنیٰ غالب تر ہوتا ہے۔ 'کارکن'، 'ممبرشپ'، 'امیر / ناظم / صدر'[12]، 'دفتر' وغیرہ ایسی لغت ملتی ہے۔ "نظم" یہاں ایک خاصی مرکزی اصطلاح

---

[12] ہم چاہیں گے، احیائے دین کو گہرائی میں جاننے کے اندر دلچسپی رکھنے والے حضرات ان نقاط کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہاں ہمارے پاس تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ 'لفظی' بحثیں ہمارے پیش نظر نہیں۔ کچھ مفہومات واضح ہو جائیں تو ہم اسے اپنے بیان کا حاصل سمجھیں گے۔ ایک اصلاحی و اِحیائی عمل میں 'امیر' یا 'صدر' یا 'ناظم' وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ابن حنبل، غزالی، ابن تیمیہ، احمد سرہندی، محمد بن عبدالوہاب وغیرھم رحمۃ اللہ علیہم کے کھڑے کیے ہوئے عظیم الشان احیائی

ہوتی ہے اور "ارشادِ عامہ" کے مقابلے پر ایک حاوی تر حقیقت]۔

9. کلاسیکل منہج چونکہ معاملے کو زیادہ 'امتوں'، 'عقیدوں' اور 'ملتوں' کی سطح پر دیکھتا ہے لہٰذا 'نظام' وغیرہ سے قطع نظر بھی یہ ہندوؤں، صیہونیوں اور صلیبیوں کی دستبرد سے مسلم ثقافت، مسلم مفادات، مسلم زمینوں، آبادیوں، پانیوں یا کسی وقت مسلم عزتوں اور آبروؤں کو بچانے کے لیے جہاد کو واجب ٹھہراتا ہے اور اسے "اللہ کے راستے کا جہاد" گنتا ہے۔ جہاں مسئلہ دو ملتوں کا ہو، وہاں یہ مسئلے کو 'دونَ مالہٖ' یا 'دونَ ارضہٖ' سے بڑا دیکھتا ہے اور براہِ راست "فی سبیل اللہ" سے جوڑتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی وقت 'گائے کی قربانی' کا مسئلہ ہی اس کے نزدیک جہاد کا مستوجب ہو سکتا ہے (کیونکہ نزاع کی طبیعت یہاں "ملتوں" والی ہے) چاہے گائے کی قربانی کرنے والوں کی سائڈ پر 'اسلامی نظام' کسی وجہ سے قائم نہ بھی ہو یا اس کی کوئی صورت ان کے یہاں میسر نہ بھی ہو۔ لیکن انقلابی فکر کی سوئی بار بار یہاں بھی، بلکہ ہر جگہ، 'نظام' کے مسئلہ پر اٹکے گی۔ روس کے خلاف افغانستان کے جہاد میں چونکہ اس ذہن کو جیت کی صورت میں 'اسلامی نظام' آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا اسلام اور کمیونزم کے مابین زندگی موت کی نوبت کو جا پہنچنے والی ایک خونیں کشمکش کو بھی یہ "جہاد" ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ یہی مسئلہ اِس ذہن کے ہاں جہادِ کشمیر اور جہادِ فلسطین کے معاملہ میں آڑے آتا رہا ہے۔ اور شاید برما اور بوسنیا وغیرہ کے معاملہ میں بھی۔ یعنی کسی جگہ کے مسلمان اگر اس قدر پسماندہ یا بے بس ہیں کہ 'نظام' سے متعلقہ موضوعات ان بیچاروں کو ازبر نہیں ہیں لیکن غیرتِ دینی اس قدر ہے کہ مسلم عزتوں کو کافر کے ہاتھوں پامال ہوتا

عمل اِس 'امیر / صدر وغیرہ ایسی اشیاء کے بغیر ہی ہوئے ہیں۔ براہِ کرم جدید اور قدیم فارمیٹ میں 'اپروچ' کا یہ فرق سمجھنے کی کوشش کیجئے، لفظوں میں مت الجھئے۔

برداشت نہیں کر سکتے اور اس پر کافر کا ہاتھ توڑنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ ذہن اُس کے جہاد کو 'فی سبیل اللہ' نہیں مانے گا جب تک کہ وہ 'نظام' کا مسئلہ ہی لے کر کھڑا نہیں ہوتا! کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کو پہنچنے والے پاکستانی نوجوانوں یا ان کی تنظیموں کے سامنے اِن حضرات کا بار بار یہ سوال لانا کہ کیا اپنے ملک میں اسلامی نظام لے آئے جو پرائے ملک کا رخ کرنے چلے، اِسی اندازِ فکر کا شاخسانہ رہا ہے۔

10. انقلابی ذہن چونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے کام کو "انقلاب" سے تعبیر کرتا ہے، لہٰذا اُس کے تمام طریقۂ کار اور مراحل کو بھی عموماً 'منصوص' کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود، اپنے طریقۂ کار کے تعین میں یہ ایک شدید غموض اور اختلاف کا شکار ہے! اپنی مثالی حالت میں، ایک انقلابی جماعت سوائے اپنی تقریر و تحریر کی ایک سرگرمی اور سوائے اپنی ایک داخلی نظم بندی رکھنے کے، عملاً کچھ نہ کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ علاوہ کچھ موہوم واقعات رونما ہو جانے کا انتظار کرنے کے، جس کا تعلق عمل سے نہیں۔ نوٹ کیجئے، ہم نے کہا: اپنی مثالی حالت میں۔ یہ ایک واقعہ ہے جو سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ تک کے 'دورِ اول' پر صادق آتا ہے۔ انقلابی جماعت کی مثالی حالت عملاً ایک عزلت isolation سے عبارت ہوتی ہے خواہ وہ اسے جتنا بھی طول دینا چاہے۔ 'نظامِ قائمہ' status quo میں شرکت، اس کو تبدیل کر ڈالنے سے پہلے، اصولاً 'نظریۂ انقلاب' کے منافی ہے۔ تاہم اگر یہ نظامِ قائمہ میں شرکت نہ کرے تو بیشتر معاشرتی فورمز سے دور، معاشرتی عمل پر اثر انداز ہونے سے قاصر، اپنے ہی مراکز میں پڑی، پرانی ہوتی رہتی ہے۔ ایک نظامِ قائمہ کے فراہم کردہ مواقع لینا اور "استطاعت" کی حد تک اس میں سے خیر نکالنا اور باقی کے معاملہ میں صابر رہنا دراصل کلاسیکل منہج ہے؛ اور انقلابی منہج کی ضد۔ لہٰذا انقلابی منہج اپنی مثالی حالت میں ایک عزلت isolation ہی ہے یعنی کچھ تقریر و تحریر اور داخلی

نظم تک محدود رہنا۔ اور جہاں تک اس کی تحریر و تقریر کا تعلق ہے تو اس کا فارمیٹ بھی چونکہ صرف عقائدی و دعوتی (ارشادِ عامہ) طرز کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں تنظیمی طرز ہی غالب ہوتا ہے اس لیے یہ تحریر و تقریر ماحول کے اندر 'دعوت' کا فائدہ بھی تقریباً نہیں دے رہی ہوتی۔ انجامِ کار؛ یہ عزلت ایک پکی پکی بند گلی ہوتی ہے؛ جس کو چھوڑے بنا چارہ نہیں۔ یہاں وہ پوائنٹ ہے کہ سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ ایسے فہمیدہ و دُور بین لوگ صورتحال کو بجا طور پر بھانپتے ہوئے؛ 'کومپرومائز' کا طعنہ سہہ لینا اپنی اسی عزلت isolation و انجماد stagnancy کا اسیر رہنے کی نسبت وارے کا جانتے ہیں، جو کہ ہمارے نزدیک آپؒ کا ایک راست اقدام ہے۔ بس کمی سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ رہ جاتی ہے کہ وہ اسے ایک 'کومپرومائز' رکھتے ہیں۔ یعنی اپنے "نظریے" میں ایک انقلابی جماعت صرف اپنے "راستے" کی حد تک غیر انقلابی ہو جائے؛ جو کہ ایک غیر طبعی جوڑ ہے۔ حالانکہ اگر پورا فارمیٹ تبدیل کر لیا جاتا اور نظریے کے اندر ہی "انقلاب" کی بجائے "ایک دی گئی صورتحال میں ممکنہ طور پر ایک بہترین کردار ادا کر جانے پر اکتفاء"[13] لے آتے... اور فلسفۂ انقلاب کے تحت جن

---

[13] یہ ہے "انقلاب" اور تبدیلی کے "روایتی منہج" کا دوسرا بڑا فرق:

انقلاب: سیاسی عمل میں ایک کامل و مثالی تبدیلی کا دوٹوک مطالبہ۔ لوگوں کو اس کا واضح باقاعدہ ہدف دینا اور اس بنیاد پر لوگوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی صدا لگانا۔

کلاسیکل: اسلام پر ایک کامل و مثالی انداز میں چلنے کا پیراڈائم تو "فرد" یا "معاشرے" کے حق میں بے حد واضح رکھنا۔ لیکن عملی میدان میں صرف اُسی چیز کے لیے کیمپین campaign اور لابنگ lobbying کرنا جو اندریں صورت "ہونے والی" نظر آتی ہو۔ اس سے بڑھ کر (عملی حوالے سے) کسی چیز کا نعرہ یا لوگوں کی امید ہی نہ لگوانا۔

فرائضِ وقت کو مؤخر یا نظر انداز کروایا جانا ہوتا ہے، باقاعدہ ایک کلاسیکل منہج پر آتے ہوئے، (غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، احمد سرہندیؒ وغیرہ کی طرز پر) وقت کے اُن فرائض ہی کو لے کر کھڑے ہو جاتے... خصوصاً معاشرے کی تعلیم اور تیاری کا ایک مؤثر اور آسان فارمیٹ سامنے لاتے ("ارشادِ عامہ" ہمارے ائمہ و مشائخ کا ایک معروف کلاسیکل منہج ہے) اور اس کو تنظیمی کی بجائے ایک بے تحاشا دعوتی رَو بنا ڈالتے تو یہ غیر انقلابی راستہ (یعنی 1۔ نظامِ قائمہ prevailing system کے اندر ہی ایک لطیف سرایت کر جانا، 2۔ نظامِ قائمہ کے اندر کارفرما عوامل factors کے ساتھ پوری ذہانت کے ساتھ کھیلنا an intelligent maneuvering، اور 3۔ نظامِ قائمہ کے دستیاب کردہ مواقع سے — نظریہ میں اپنے ایک ٹھیٹ پیراڈائم پر رہتے، مگر عمل میں استطاعت اور موازنۂ مصالح و مفاسد کے منہج پر چلتے ہوئے — بھرپور گنجائش لینا)[14] یقیناً آپؐ کو کچھ بہت کارآمد منزلوں پر پہنچاتا۔ یہ منزل ظاہر

یہ تاثر درست نہیں کہ ہمارے ائمہ کا وہ (کلاسیکل) منہج کوئی تبلیغی جماعت ایسا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہمارے یہ ائمہ وقت کے سماجی، سیاسی و تہذیبی عوامل پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ بس یہ اندازہ رکھتے تھے کہ ایک 'دی ہوئی صورتحال' میں in a given situation کیا چیز ملنے کی ہے جسے منہ پر لایا جائے اور حکمران یا عوام طبقوں میں اس کی تحریک اٹھا دی جائے... اور کیا چیز ایسی ہے جو اندریں صورت ہونے والی نہیں ہے اور اسے مانگ کر یا اس کا شور اٹھا کر کہیں اس چیز سے بھی جائیں جو ہو سکتی ہے۔ نیز اندریں صورت "جو نہیں ملنے والا" اس کی 'جدوجہد' میں لگ کر وہ بہت سے شعبے موقوف یا متاثر ہوں جو اندریں صورت چلنے والے بھی تھے اور امت کے حق میں فوری و ناگزیر بھی۔

[14] "انقلاب" اور تبدیلی کے "روایتی منہج" کا یہ تیسرا بڑا فرق ہے۔

ہے 'انقلاب' تو نہ ہوتا (اِلّا اَن یشاءَ اللہ) لیکن معاشرے میں اسلامی عمل کی ایک کمال پیش رفت ضرور ہوتا۔ نیز بعد کی فرسٹریشن frustration کی نوبت بھی یہ چیز نہ آنے دیتی۔

11. یہ واضح کرتے چلیں، ذہنوں کا یہ فرق دعوتی یا سیاسی دنیا تک محدود نہیں۔ خود جہاد (معاصر) میں یہ دونوں دھارے برابر پائے جاتے ہیں۔ عبد اللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ نوجوانوں پر حملہ آور اُس ذہن کو بڑی ابتداء میں بھانپ گئے تھے جو جہادِ افغانستان پر یہ سوال اٹھا رہا تھا کہ: افغانوں کے سات جماعتی اتحاد کی حالت تو دور دور تک نہیں بتا رہی کہ روس کو نکالنے کے بعد یہ ملک میں 'اسلامی نظام' نافذ کر لیں گے، پس یہ جہاد کیسا؟! یا کسی وقت یہ نوجوان جہادِ افغانستان پر اس حوالے سے سوال اٹھاتے کہ: یہ تو کچھ غیر شرعی حکومتوں اور انٹیلی جنسوں سے مدد لیتا ہے پس یہ جہاد کیسے؟! [وجہ وہی: تاریخی طور پر مسلمانوں کے منہج استطاعت کو نہ جاننا۔ اور "**ایک دی ہوئی صورتحال میں ممکنہ طور پر بہترین کردار ادا کر جانے پر اکتفاء**" کے کلاسیکل منہج کو رد کرنا، اس لیے کہ ایک 'مکمل مطلوب صورتحال' تو یہاں پیدا ہو ہی نہیں رہی! لہٰذا صورتحال 'جتنی بہتر ہو سکتی ہے' اس کو بھی خاطر میں نہ لانا بلکہ صاف مسترد کر دینا۔ اور 'شر کو جتنا دفع کیا جا سکتا ہے' یہاں اس کا بھی روادار نہ ہونا۔ یہ انقلابی منہج بنیادی طور پر ایک مثالیت پر قائم ہے۔ جبکہ کلاسیکل منہج: ایک دی ہوئی صورتحال کے اندر ہی جو مصالح اور مفاسد ہیں ان کا ایک واقعاتی موازنہ؛ نیز جو چیز ایک دی ہوئی صورتحال میں آپ کو مل ہی نہیں سکتی اس کے لیے نہ ضد کرنا، نہ نعرے لگوانا، نہ اس سے لوگوں کی یوں امیدیں وابستہ کروانا گویا وہ تو کسی بھی موڑ سے برآمد ہوئی کہ ہوئی! چونکہ یہاں واقعیت پسندی ہے؛ لہٰذا کلاسیکل منہج حوصلے پست ہونے کی کوئی بنیاد ہی سرے سے نہیں چھوڑتا، (کہ ان

حوصلوں کو بحال کروانے کے پھر ڈھیروں جتن کرنے پڑیں)۔ ظاہر ہے بچوں کے ساتھ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہنڈیا میں پانی چڑھا کر ڈوئی ہلاتے رہیں کہ آخر انہیں نیند آجائے گی اور صبح اٹھ کر کوئی اور ہاتھ پیر مار لیں گے، بڑوں میں البتہ ایسی 'نیند' نہیں رکھی گئی! چنانچہ کلاسیکل فقہ کا یہ "مصالح و مفاسد کے موازنہ" والا قاعدہ ایک نہایت واقعاتی اور بری سے بری صورتحال میں کام دینے والا اصول ہے؛ جو دینی عمل کو ایک کمال ڈائنامزم dynamism دیتا ہے (ڈائنامزم اُسی وقت آتا ہے جب اس کے اندر ایک گونا لچک flexibility ہو)۔ انقلابی ذہن چونکہ مثالیت میں رہتا ہے (یوٹوپیا، جو 'لچک' جانتا ہی نہیں)، لہٰذا اس طبقے کے نوجوانوں کے یہاں فقہاء کے "مصالح و مفاسد" والے قاعدہ کا مذاق تک اڑایا جاتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے، اس ٹھٹھے اور مذاق سے عبد اللہ عزام کو بھی خوب نوازا گیا۔ عبد اللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ جب اپنے خطبوں میں کہتے: "مت توقع رکھو کہ افغان مجاہدین ادھر روس کو افغانستان سے نکالیں گے اور ادھر ملک میں اسلامی نظام کا دور دورہ ہو جائے گا۔ بھائی یہاں بہت کچھ چیزوں سے ابھی تمہیں گزرنا ہے۔ بڑی بڑی گھاٹیاں اور کھائیاں ہیں۔ فی الحال ایسی کسی بات کی توقع مت رکھو"۔ تو اس پر پشاور کے کچھ عرب حلقوں میں ایک قہقہہ پڑتا۔ عبد اللہ عزامؒ پر کھل کر تنقید ہوتی کہ لو یہ بات ہے تو پھر جہاد کرنے ہی یہاں کیوں آئے۔ 'اسلامی نظام' نہ آیا تو ہم تو ان افغان قیادتوں کو گریبانوں سے پکڑیں گے]۔ نوجوانوں کے ذہنوں سے ایسے اشکالات کو رفع کرنے پر عبد اللہ عزامؒ کی اچھی خاصی محنت ہوئی تھی۔ اور کچھ 'فاصلے' بھی بڑھتے گئے۔ آخری سالوں تک پہنچتے پہنچتے ایک شدت پسند طبقہ جہادی دنیا کے اندر عبد اللہ عزامؒ کے منہج کو صاف رد کرنے لگا، واقفانِ حال سے یہ ہرگز اوجھل نہیں۔ یہی طبقہ تھوڑی دیر میں الجزائر کے اندر شروع ہونے والے مسلح عمل کا روحِ رواں ہوا۔ اور اس سے سامنے آنے والے نقصانات اب ہر کسی کو معلوم

ہیں۔ لیکن یہاں سے ایک اور چیز مسئلہ سے جڑتی ہے اور وہ ہے تکفیر۔ اس سے مابعد نقصانات کا تعلق البتہ اِس نئی فکر (تکفیر) سے ہے۔ یہ بالکل ایک اور چیز ہے۔ محض انقلابی ڈسکورس کو اس کا بوجھ اٹھوانا ہماری نظر میں زیادتی ہو گی۔ ہاں یہ واضح کر دینا مناسب اور ضروری ہے کہ: جہاد کے باب میں **کلاسیکل ڈسکورس** کی حامل جماعتیں وہی ہیں **جن کی نظر اپنے ملکوں کی داخلی صورتحال سے متعلق 'نظام' کے مسئلے میں اٹک نہیں جاتی**۔ اس سے گزر کر؛ وہ اپنی قوموں کی تمام تر کمیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے علی الرغم کافروں سے ان کا دفاع کرنے پر یقین رکھتی ہیں اور مسلم خون، مسلم مفاد، مسلم زمین اور مسلم استحکام کی محافظ ہیں۔

اب یہ کہنا ظاہر ہے تحصیلِ حاصل ہو گا کہ... ہمارا اپنا فکری قبیلہ دین کا یہی کلاسیکل ڈسکورس ہے؛ اور اسی کے رجال ہمارے ائمہ و اساتذہ۔ اسی کے اندر ہم اسلام کا اِحیاء اور قوت دیکھتے ہیں۔ اس منہج میں جو ایک کمال لچک flexibility اور فاعلیت dynamism ہے... ہم بجا طور پر یہ کہتے ہیں: اس سے کما حقہٗ استفادہ ہمارے یہاں ابھی ہو انہیں؛ ورنہ اس کے اعلیٰ ثمرات دیکھے جاتے۔ اب بھی اس کی جانب آنے میں کوئی حرج نہیں۔